

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

یوں تو اسلام ہمیشہ طہیدین و منافقین کی تاویل بازیوں اور فتنہ آرائیوں کا تختہ مشق رہا ہے لیکن اس کے ساتھ جو افسوسناک سلوک پاکستان کے متحد پسند اصحاب کر رہے ہیں، اس کی داستان ٹبری ہی الم لیکچر ہے یہ کیرکٹر تو سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی جس چیز کو نہ مانے، خم ٹھونک کر اس کی مخالفت کسے اور جس چیز کو مانے اس کے لیے جان کی بازی لگا دے لیکن یہ کیرکٹر سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی ایک چیز پر ایمان کا دعویٰ کسے، اُس کے خدائی اور آسمانی ہونے کا اقرار کرے اور دوسری طرف اس کے ایک ایک جُز اور ایک ایک پہلو پر شبہات وارد کرے اور اس میں ترمیم کی تجویزیں بھی پیش کرنا چلا جائے۔ آج ستر قسم کے سوالات ہمارے ہاں خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھانے جا رہے ہیں مثلاً یہ کہ

نیط و دلاوت اسلام میں جائز ہے یا ناجائز، مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، پردہ غسلتے شریعت کے مطابق ہے یا مخالف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے احکام و فتویٰ میں یا ابدی، ان میں سے کون سے ایسے ہیں جو جنگامی ہیں اور کون سے ایسے ہیں جن کی پیروی تمام علاقوں میں، ستر قسم کے حالات میں لازم ہے، قص و دسرود اور عیش و طرب کی مجالس کے انعقاد کی اسلام کہاں تک اجازت دیتا ہے۔ یہ سوالات عقل بار نہ نہیں کر سکتی کہ کسی ایسے شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکیں جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ سوالات تو صاف ایسے ذہنوں کی پیداوار ہیں جن کا اسلام سے کوئی ربط باقی نہیں رہا ہے لیکن وہ اسلام سے علم کھلا اپنی نجاوت کا اعلان اس وجہ سے نہیں کرتے کہ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اسلام کو تقبلاً نقصان پہنچا سکتے ہیں اور تبنا مسلمانوں کے ذہنوں کو اٹھجھکتے ہیں اتنا وہ اُس شکل میں نہیں کر سکتے جبکہ وہ اسلام سے اپنی غلطی کا اعلان کر دیں۔

یہ سوالات جو آئے دن نت نئے خنزوں کی صورت میں ابھارے جاتے ہیں ان کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ امتی ہی ہمارے قومی مسائل میں جنہیں حل کرنے کے لیے ہمارے ہی خواہاں قوم سخت مصائب میں اور انہیں اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ اگر ان کا بروقت حل تلاش نہ کیا گیا تو ہمارے سفینہ حیات کو دقت کی بیرحم موج میں پاش پاش کر دیں گی۔ دراصل ان مسائل کو خنزوں کی شکل میں بہاں ایک سوچی سمجھی ایکسکم کے مطابق زبردستی پیدا کیا جا رہا ہے کیونکہ اسلام کے بارے میں اب متفرغین کی کوئی آرزوئیں پوری ہونے کی کوئی دوسری صورت بجز اس کے ممکن نہیں رہی ہے کہ اس کے اندر سے نقیب لگائی جائے۔

اسلام کے رستے میں فراموشی ماسی میں بھی پیش کی گئیں لیکن ماضی کے دشمن اتنے بزدل اور نڈرھے نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ وہ جب مخالفت کرتے تو باہل کھل کر کرتے، لیکن سری لاگ سپیٹ کے کرتے اور جیب اسے قبول کرتے تو پھر اس میں بھی وہ مخلص ہوتے تھے۔ دشمن تو وہ بلاشبہ تھے لیکن ان میں چند نیاداری انسانی خصوصیات ایسی تھیں جن کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ان کے مقابلے میں آج کا دشمن بڑا دوں سمیت اور کمزور ہے۔ وہ سامنے آکر کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ چھپ کر شخون مارتا ہے۔ اُس نے میدان جنگ میں کھڑے ہو کر لڑنے کی بجائے گوریلا وار کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہاں اسلام کا راستہ روکنے کی متر و متر کوشش کی لیکن اس فرحت میں بھی اُس کی روش بڑی ہی بزدلانہ تھی۔ اُس نے کبھی کھل کر یہ نہیں کہا کہ میں اسلام نہیں چاہیے۔ اس کے بجائے اس نے ہزار میلے بہانے بنا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کیے کہ دکھیو! اگر پاکستان کو اسلامی مملکت بنا پایا تو اس کے یہ اور یہ نقصانات ہونگے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے دل میں اسلام کے متفقہ طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کو یہ یقین ہی نہ رہے کہ آج دنیا میں اسلامی قانون کسی مملکت کی بنیاد بن سکتا ہے۔

جیب اس کے یہ سارے حربے ناکام ہوئے اور قوم نے اس کے مزے سے یہ اگلا ہی لیا کہ یہ ہرگز نہیں پاک اسلام۔ اور صرف اسلام۔۔۔۔۔ کے لیے وقف ہے اور یہاں کا انتظام حیات وہی ہوگا

جو اللہ اور اُس کے رسول نے ہیں دیا ہے تو ان حالات میں ایک باخیر انسان کی طرح اس گروہ کا فرض تھا کہ اگر کسی یہ بات قابل قبول نہ تھی تو وہ میدان سے ہٹ جاتا لیکن اُس نے محض جاہ و منصب کے لاپرواہی سے تیسرے نمونہ اور نظریاتی اختلاف کے باوجود مسندِ اقتدار پر متمکن رہا۔ اگر کبھی تک اس نے اپنی مخالفانہ روش نہیں چھوڑی بلکہ اُس کی مسلسل کوششیں یہی ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں نے ریاست کے اندر مسلم رسوخ کا جو بنیاد بنا دیا ہے اور جس دستور کی و نفاذ کی کا بعد کہ اُسے اقتدار نصیب ہوا ہے، اس میں اب اتنے رخصتے پیدا کر ڈیئے جائیں کہ مغربی معاشرت کا سیلاب اس کے اندر بڑی آسانی سے گس آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اب یہ بالکل چوبھوں کی طرح اس صدارت اور دھڑا دھڑا شگاف کرنے میں مصروف ہے۔ کبھی وہ شریعتِ اسلامی کے مجموعی دھانچے میں نہایت عیاری کے ساتھ چند ایسی چیزوں کو منتخب کرنا ہے جو جدید تہذیب و تمدن کے دلچسپ درواج کے خلاف پڑتی ہیں اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمانوں کے ذہن میں اختلاف پیدا کیا جاتا ہے، کبھی علماء کو ہدف بنا کر امت مسلمہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہی لوگ درجِ مصیبت ہیں کبھی مسلمانوں کو نہایت ہی معصومانہ انداز میں یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو تفرقہ اور تذبذب کی دعوت دی گئی ہے، اُس نے عقلِ انسانی پر کسی قسم کے پہرے نہیں ٹھاسے تو ہم پھر پھیلوں کی لکیر کے فیقرین کے کیوں رہ جائیں یہ باتیں بظاہر بُری دکھش ہیں لیکن ان کے پس پردہ جو عزائم ہیں وہ ایسے نہیں جن سے صرف نظر کیا جاسکے۔ یہ ساری باتیں بالکل دوسرے مقاصد کے لیے کہی جاتی ہیں۔ وہ مقاصد جو اسلام کی عین ضد ہیں۔

ان صفحات میں ہم آج اسی مشرب کے ایک نکل مر سجد کے خیالات پیش کرتے ہیں جن سے مسلمانانہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کس حکمت اور دانائی کے ساتھ اسلام کے اندر دیکھنے پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

چند روزہ ہمارے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں پاکستان کی عدالتِ عالیہ کے ایک محترم

رکن نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا :

مجھے مولانا ابوالحسنات سید احمد کی تقریر کے اس حصہ سے اختلاف ہے جس میں مولانا نے کہا تھا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ضابطے اور قوانین موجود ہیں۔ قرآن مجید واقعی ایک الہامی کتاب ہے اور اس میں حیات انسانی کے متعلق ہدایات بھی ملتی ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ قرآن زندگی کے سارے شعبوں کے بارے میں احکامات دیتا ہے۔ اس نے معاشرت اور اخلاق کے متعلق چند اشارے کر دینے پر اکتفا کیا ہے اور ہمیں تاکید کی ہے کہ ہم عقل و فکر کی قوتوں کو بروئے کار لاکر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو تدبیر اور فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

ہمارے قدیم فقہاء نے قرآن مجید سے استخراج کر کے اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق احکامات مرتب کیے۔ وہ احکامات خواہ اپنے فقہ کے لیے کتنے ہی قیمتی اور مفید ہوں لیکن وہ عہد جدید کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارے لیے ازسبب ضروری ہے کہ ہم اپنے دہد کے لیے نئی فقہ مرتب کریں جس میں اسلام کی ایک ایسی تعبیر موجود ہو جو موجودہ حالات سے مناسبت رکھتی ہو۔ امتدادِ زمانہ سے ملکوں اور قوموں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، تمدن کے نئے نئے تقاضے ابھرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ماضی کے فقہی استنباط کو زمانہ حال کے لیے قبول کر لینا صحیح اور درست نہیں۔“

حداشب موصوف کے یہ خیالات کچھ ایسے نہیں کہ لوگوں سے ڈھکے چھپے ہوں، ان خیالات کا اظہار انہوں نے کئی بار مختلف موقعوں پر کیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کریں۔

مندرجہ بالا مسطورہ کا اگر منظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ فاضل مقرر اپنے سامعین کو مندرجہ

ذیل تاثرات دینا چاہتے ہیں :

دلی یہ کہ قرآن نے کوئی چیز تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کی بلکہ چند اصولی باتیں بیان کر دی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں تفکر و تدبیر کی دعوت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم جو چاہیں اصول اور نظریے وضع کریں۔
 (ب) جس معاملے میں قرآن نے ہمیں کچھ اصول دیئے ہیں، اس میں تو ہمیں انہیں کی پیروی کرنی چاہیے لیکن اس باب میں احکام الہی کی جو تعبیر و توجیہ ہم کرنا چاہیں اس کا ہمیں پورا پورا اختیار حاصل ہے باقی رہے زندگی کے وہ معاملات جن کے بارے میں قرآن نے کوئی واضح حکم نہیں دیا اور جن کا تناسب اول الذکر سے کہیں زیادہ ہے، ہمیں صرف اپنے تفکر و تدبیر پر اعتماد کرنا چاہیے۔

(ج) چونکہ ہمارے فقہاء اور ائمہ ایک خاص دور اور علاقے میں رہے، اس لیے ان کی نگاہ صرف اس دور یا علاقہ کے مادی حالات میں الجھی رہی۔ انہوں نے جو کچھ سوچا صرف اپنے عہد کے لیے سوچا اور جو کچھ کیا صرف اپنے وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر کیا اس لیے فقہ کے جو مختلف مدارس فکر آج سے صدیوں پیشتر انسانی تمدن و اخلاق کی اصلاح کے لیے وجود میں آئے تھے وہ موجود نہ تھے یا فقہ اور تبدیل پذیر حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ یہ مذاہب ایک خاص ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، موجودہ زمانہ میں جب کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور انسانی تمدن ایک نئے ارتقائی دور سے گذر رہا ہے، ان مذاہب کے قانونی حکام پر عمل کرنے کی کوشش بے سود اور لالچینی ہے۔

آئیے اب دیکھیں کہ ان ارشادات کے اندر اسلام کی مخالفت کے کیا کیا پہلو چھپے ہوئے ہیں۔

جب اس طرز خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں واضح اور مفصل قوانین موجود نہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضابطہ حیات کے لیے نسیل کا ایک نہایت ہی مدہم سا خاکہ پیش کرتے پر اتفاق کیا ہے اور پھر انسانوں کو اس بات کی بالکل کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ اس میں اپنے اپنے خیال کے مطابق جس طرح چاہیں رنگ آمیزیاں کرتے رہیں۔ یہ طرز فکر اسلام کے بالکل سطحی اور سرری مطالعہ پر مبنی ہے۔ یہ حضرات اپنے سامنے اسلام کا صرف ایک پہلو رکھتے ہیں مگر دوسرے پہلو کو یکسر

نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ حقیقت غالباً ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اللہ نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبر بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اس ہادی برحق نے خدا کی پیش کردہ اسکیم کے مطابق حیات انسانی کا رقیع الشان قصر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ تعمیر کر کے دکھا دیا ہے۔ قرآن حکیم زندگی کے ایک پہلو کے متعلق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتانے کی بجائے صرف ہر شعبہ زندگی کے حدود و اربعہ کو متعین کر دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑے کر دیتا ہے جو اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیے، لیکن ان ہدایات کے مطابق عملاً انسانی زندگی کی تشکیل اور صورت گیری کرنے کا کام سرورِ بدو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و رہنمائی کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کے پیش کردہ خاکے میں سے زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات ڈھونڈنا سعی لاحاصل ہی نہیں بلکہ لیک زبردست گمراہی بھی ہے۔

اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں تدبیر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ اسی دعوت کا اعجاز تھا کہ مسلمانوں نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، فہم و ادراک کے گیسو سنوارے اور غور و فکر کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام نے جس عقل کی طرف دعوت دی ہے وہ دورِ جدید کی بنجر عقلیت پرستی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اسلام نے دورِ جدید کے عقلیت پرستوں کی طرح عقل کو بے زمام نہیں چھوڑ دیا کہ وہ جہر چاہے جہائے اوجو چاہے کرے۔ اس نے خود عقل کو بھی اس کی حدود و قیود سے آگاہ کیا اور اسے ایک "عقل کل" کے تابع ہو کر چلنے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار آیات مل سکتی ہیں لیکن ہم یہاں صرف دو نقل کرتے ہیں:

جو لوگ اس رسول نبی اسی کی پیروی کرتے ہیں . . .
اور جنہوں نے اُس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ . . .
وَاتَّبَعُوا النَّوْرَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ . . .

أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ - (الاعراف - ۱۵۷)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكُمْ فِيمَا
شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حُجْبًا
مَّا نَقَضْتُمْ وَلْيَسِّرُوا السَّبِيلَ - (النساء - ۶۵)

اتما گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

پس نہیں تمہارے رب کی قسم (اے محمد!) وہ مومن نہیں
ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جہان کے درمیان
واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور تمہارے فیصلے سے اپنے
دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں بلکہ تمہارے
فیصلے کو سرسبز تسلیم کریں۔

قرآن مجید کی یہ تصریحات بالکل کھلے الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے
فلاح و کامرانی کا واحد معیار خداوند تعالیٰ کے احکام کا اتباع اور اس کے رسول کی سنت کی پیروی ہے۔ اس
کی عقل کی ساری تگ و تازہ، اُس کے فہم و ادراک کی ساری جولانیاں صرف اسی ایک مقصد تک محدود ہیں
کہ کسی طرح خدا اور رسول کا نشانہ معلوم کیا جائے۔ اسلام میں یہی تدبیر اور تفکر قیمتی اور قابلِ حد ستائش
ہے لیکن جہاں غور و فکر سے مراد یہ ہو کہ آدمی بالکل آزاد ہو کر مختلف وادیوں میں ٹامک ٹوٹیاں مارتا پھرے
وہاں ضلالت اور گمراہی ہے۔ اور ایسے فہم و ادراک سے ہر مسلمان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

رہی فاضل حج کی یہ بات کہ قبیلے کے سارے استنباط ہو کہ ان کے اپنے اپنے ماحول کی پیداوار تھے، اسی
لیے وہ وقتی اور عارضی ہیں، حیات انسانی کے نہایت سطر مطالعہ پر مبنی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی خارجی زندگی اور زندگی ماحول میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں
لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اصول و نظریات میں بھی تغیر کرتے چلے جائیں۔ انسان کا معاشرتی
ارتقاء تجربہ کی بنیاد پر قائم ہے اور تجربہ کا تعلق ماضی ہی سے ہے۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ ماضی
کے خیالات و تصورات صرف اپنے اپنے زمانے تک محدود تھے اور حال اور مستقبل کے لیے وہ کوئی
قیمت نہیں رکھتے تو پھر ہمیں لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے تجربات بالکل بے معنی ہیں کیونکہ تجربہ
کا سارا مواد گذشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہمارے والدی حالات گذشتہ حالتوں سے

نوعی اختلاف رکھتی ہے تو پھر یہ بات ناقابلِ فہم بن جاتی ہے کہ ایک انسان آنے والے حالات و واقعات میں اپنے گزشتہ تجربات سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ ان تجربات کی ترتیب ان اعمال و واقعات کی بنیاد پر ہوتی ہے جنہیں آنے والی حالتوں سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ اس الجھن کو بعض لوگ یہ کہہ کر حل کرتے ہیں کہ نئے حالات میں عقل انسان کی راہ نمائیتی ہے۔ مگر اس میں پھر یہ وقت پیش آتی ہے کہ خود عقل تجربہ کا ایک وظیفہ ہے اُسے جو کچھ مراد ملتا ہے تجربہ ہی کے ذریعہ ملتا ہے لہذا تجربہ کے بغیر اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

اس معاملہ میں جتنا غور و فکر کیا جائے یہی معلوم ہوگا کہ انسان کا انفرادی یا مناسرتی تجربہ صرف اسی صورت میں مفید اور کارآمد ہے جب ہر نئی حالت اور گزرے ہوئے حالات میں کوئی اساسی فرق نہ ہو اور اگر ان کے مابین اختلاف کی نوعیت بنیادی ہو تو پھر ماضی کی ہر چیز ہمارے لیے عبرت اور سبق ہے اور اس قابل ہے کہ ہم اُسے دریا بُدو کر دیں۔ لیکن اصل صورت حال یہ نہیں، ماضی، حال اور مستقبل میں فرقی کی نوعیت نوعی نہیں بلکہ سرسری ہے اور اسی بنا پر ہم حال اور مستقبل کی تعمیر ماضی پر کرتے ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے ایشیج پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس لیے ایک عقل مند انسان ماضی سے انحراف نہیں کرتا بلکہ حال کی ترکیب و تشکیل ماضی کی اساس پر کرتا ہے۔ آج جو محرکات ہیں تعمیر و تخریب کی طرف لے جاتے ہیں وہ ان محرکات سے بالکل مختلف نہیں۔ جو گزشتہ زمانوں کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمارے اسلاف کے استنباط ہمارے لیے اسی طرح کا۔ آمد میں جیسے کہ ہمارے اپنے عہد کے علما کے۔

پھر اس طرزِ استدلال میں دوسری غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں اسلاف کے اساسی فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ فلسفہ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسانی ذہن کی اقتاد کچھ اس قسم کی ممانع ہوتی ہے کہ وہ مادہ اور سرحد ادراک کو کھینچ تان کر محسوسات کے دائرے میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یاد دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ذہن مافوق طبعی

حقائق کو بھی عالمِ طبیعی کے خم و پیچ میں گرفتار کرنے کے لیے پتیا ب رہتا ہے۔ یہ غالباً اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے کہ یونانیوں نے اپنے خداؤں تک کو عصرت اور ارضیت کے لباسوں میں ملبوس کر کے انہیں اہل دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اسلام نے اس طرزِ فکر کو بالکل غلط قرار دیتے ہوئے، اس کے برعکس بالکل دوسرا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ اُس کے نزدیک نہ صرف خالقِ کائنات ہر قسم کی مادی آلائشوں سے پاک اور منزہ ہے بلکہ اُس کے رسول کی سنت بھی زمان و مکان کی ساری حد بندیوں سے آزاد ہے۔ اسلام نے دنیا پر براہِ پوری طرح آشکار کر دیا ہے کہ جس طرح قانونِ طبیعی کے مطابق یہ کائنات ایک وحدت ہے اسی طرح قانونِ شرعی کی رو سے بھی یہ ایک ہی ہے۔ امروز فردا کے درمیان جو حجابات ہیں نظر آتے ہیں وہ محض بیماریِ نظر کا دھوکا ہیں۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصہٴ حسدِ بدید و قدیم

چنانچہ دیکھیے مسلمانوں کے ہاں آج تک جتنے ائمہ و صلحاء اور مجتہدین گزرے ہیں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ تم ہمارے احوال کو زمان و مکان کے مصالح پر پرکھ کر دیکھو اگر وہ ان پر پورے اتاریں تو انہیں قبول کر لو اور اگر وہ اس کے مطابق نہیں نظر آئیں تو انہیں رد کر دو۔ ان حررگانِ امت نے جس بات پر اپنا سارا زور صرف کیا وہ یہ تھی کہ تم مثلثے رسول معلوم کرنے کی کوشش کرو اور اگر کوئی چیز اُس کے خلاف پاؤ تو اسے رد کر دو۔ ہم یہاں ان بزرگوں کے چند احوال پیش کرتے ہیں:

امام شافعی فرماتے ہیں:

میں جو بات بھی کہوں اور جو اصول بھی ٹھہراؤں جب

ہما قلت من قول او اصلت من

اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہ سے مل جائے

اصل فیبلغ عن رسول اللہ خلاف ما قلت

تو پھر حضور ہی کی بات اصل ہے۔

قال قول ما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں یہ قطعی فیصلہ صادر فرمایا:

لیس لاحد مع الله ورسوله
کلام -
اللہ اور رسول کی بات کے ہوتے مجھے کسی کی بات
کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

امام مالک کا قول ہے:

ما من احد الا هو ما خوذ من كلامه
ومرود عليه الا رسول الله
رسول اللہ کے سوا ہر شخص کے کلام میں قابلِ نقد
اور قابلِ ترک باتیں ہیں۔

اسی طرح امام ابو حنیفہ کا ارشاد ہے:

لا ينبغي لمن لم يعرف دليله ان
يفتي بكلامي
جو شخص یہ نہ معلوم کر سکے کہ ایک بات میں نے
کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ
میرے قول پر فتویٰ نہ دے۔

ائمہ کرام کے یہ اقوال اس تحقیق کے پوری طرح آئینہ دار ہیں کہ ایک مسلمان احکامِ الہی میں جس
چیز کی تلاش و جستجو کرتا ہے وہ اپنے دل پسند افکار و نظریات کی تائید نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کی موافقت ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ چونکہ فقہ اسلامی کی تدوین کرنے
والے علماء ایک مخصوص زمانے سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف ممالک کے رہنے والے تھے اس لیے
ان کی رائے ہمارے زمانوں کے لیے صرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتی، بالکل غلط ہے اور ایسا تصور بالکل
خود فریبی پر مبنی ہے۔ ہم ائمہ سلف کے اجتہاد کو صرف اس لیے پس پشت نہیں ڈال سکتے کہ ان کا زمانہ
اور تھا اور ہمارا زمانہ اور ہے، وہ کسی خطہ زمینی سے تعلق رکھتے تھے اور ہم بالکل ایک دوسری سرزمین
میں بستے ہیں۔ اسلامی اجتہاد میں زمان و مکان کا فرق اصل اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم ان ائمہ اور مجتہدین
کی اگر کسی بات کو ٹھکرانے کے مجاز ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ احکامِ الہی اور سنتِ نبوی میں
ان کی دلیل سے محکم تر کوئی دلیل نہیں مل جائے۔ اس لیے اسلام میں کسی کے اجتہاد کو وقتی مصلحتوں
کے معیار پر جانچنے کی بجائے اُسے تعلیماتِ رسول پر پرکھا جاتا ہے۔ اگر کسی امام کا استنباطِ احکام
الہی اور سنتِ خیر البشر کی کسی محکم بنیاد پر قائم ہے تو وہ بھی بالکل اہل اور ناقابلِ تغیر ہے۔ اگر سارے

یہاں کے لوگ بھی مل کر اس میں مصلحت کے پیش نظر کوئی رد و بدل کرنا چاہیں تو انہیں یہ حق نہیں پہنچتا۔

ان گزارشات سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمیں سرے سے وقت اور حالات کے تغیر و تبدل کی اہمیت ہی سے انکار ہے۔ ہمارا منشا صرف اسی قدر ہے کہ تعلیمات الہی زمان و مکان اور اس کے مصالح کی پابند نہیں وہ ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ فقہانے جو یہ اصول پیش کیا ہے کہ الاحکام بتغییر یتغییر الزمان تو یہ فارمولہ ہر قسم کے قوانین کے متعلق درست نہیں بلکہ یہ انہیں چیزوں کے متعلق صحیح ہے جن پر زمانہ اور وقت کی چھاپ نہایت گہری ہو اور جن کی بنیاد و خالصتہ عرف یا مصلحت پر نہ ہو۔ مثلاً ملک کی صنعتی ترقی کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا، ملازمین کے اوقات متعین کرنا، یا ہنگامال وغیرہ کا انتظام و انصرام کرنا، یا ریل گاڑیوں کا انضباط۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم یہاں اجتہاد کے بارے میں ایک بالکل انوکھے نقطہ نظر کا بھی تذکرہ کریں۔ آج تک اجتہاد کے لفظ سے امت مسلمہ جو کچھ سمجھتی رہی ہے وہ ہے دین کے اصلی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنا۔ اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل کا واقعہ مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مین کا عامل اور قاضی بنا کر بھیجا۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو آپ نے دریافت فرمایا:

کیف تفضی اذا عرض لك فتشاور؟	معاذ اتم ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کیسے کرو گے؟
قال: اتضی بکتاب اللہ!	عرض کیا: کتاب اللہ سے!
قال: فان لم تجد فی کتاب اللہ	ارشاد ہوا: اگر اس میں نہ ملا تو؟
قال: فسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	بوسے: سنت رسول اللہ سے!
قال: فان لم تجد فی سنہ رسول اللہ	فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملا، تو؟
قال: اجتهد برأی ولا آلو	جواب دیا: پھر میں اجتہاد سے کام لوں گا اور اپنی سی

کوشش میں کوئی گسر نہ اٹھا رکھو نگار یعنی میں اجتہاد میں حق و صواب کی تلاش میں اور روح شریعت کے قریب تر پہنچنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرونگا۔

سرکار رسالت یہ جواب سن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو اپنی خوشنودی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ ایک واقعہ اجتہاد کی حدود اور طریق کار کو متعین کرنے کے لیے بالکل کمافی ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے ائمہ اور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اجتہاد کی بنیاد احکام الہی اور اسوۂ رسول ہے اور ان دونوں سے صرف نظر کر کے اسلام کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کوئی اجتہاد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی لغوی تعریف کرنے کے بعد اس کی فنی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

”اصولیوں کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔“
امام شاطبی کی المرافعات میں اجتہاد کی یہ تعریف ہے:

”اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔“

اسی طرح صحیحی محصاتی نے اپنی تصنیف فلسفۃ التشریح فی الاسلام میں اجتہاد کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

”لغت میں اجتہاد کے معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں

اس سے مراد وہ کوشش کرنا ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے

یعنی دین کے ان سر مشپوں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا۔

پھر دور جدید کے دو بہت بڑے علماء صلیح احمد زرقا اور محمد ابو زہرہ نے اسلامی کلویم میں

اجتہاد کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ بھی مندرجہ بالا تعریحات کے عین مطابق ہے۔

مصطفیٰ احمد زین العابدین صاحب اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
 "اجتہاد نام ہے نوبہ نو و انعات و مسائل میں شریعت کے تفصیل و اطلاق سے شرعی احکام
 مستنبط کرنے کا"

محمد ابو زہرہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
 "فقہ اسلامی میں اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ فقیر و اہل شرعیہ سے عملی احکام مستنبط کرنے کی
 پوری پوری کوشش کرے"

ہم نے علماء قدیم و جدید کے جملہ اقوال نقل کیے ہیں ان سے ہمارا مقصد اس امر کی وضاحت کرنا ہے
 کہ مسلمانوں کے ہاں آج تک اجتہاد کا جو تصور پایا جاتا رہا ہے وہ صرف ایک ہی ہے کہ زندگی کے
 پیش آمدہ مسائل میں رضائے الہی اور رضائے رسول کو معلوم کیا جائے۔ یہ دونوں وہ اصل بنیادیں ہیں جن
 پر اجتہاد کی عمارت تشکیل پاتی ہے اور اگر ان بنیادوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر وہ اجتہاد اسلامی
 لفظ نظر سے اجتہاد نہیں رہتا بلکہ وہ محض آنا و خیالی بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ چیز ایک غیر مسلم کی نظر میں تو
 ممکن ہے کسی حد تک پسندیدہ ہو لیکن یہ بات کسی ایسے مسلمان کو زیب نہیں دیتی جس نے خدا کو اپنا
 حاکم اور رسول کو اپنا پادری اور مطاع تسلیم کیا ہے۔

لیکن اسے ہماری بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ آج ایسے ایسے مدعیان علم دین پیدا
 ہو رہے ہیں جو اجتہاد کے معاملہ میں نصوص تک کو نظر انداز کر دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس قسم کے
 خیالات کا چند روز پیشتر ایک عالم دین کی طرف سے اظہار کیا گیا ہے۔ وہ دائرہ اجتہاد کی دستوں
 کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکثر حضرات نے برائے مصلحت نصوص سے متعلق مقبول روش اختیار کرنا مناسب نہیں
 سمجھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ اجتہاد و فکر کی تک و تا از صرف انہی مسائل تک محدود رہے گی جو کتاب
 سنت میں مذکور نہیں ہیں اور جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی تصریحات پائی جاتی ہیں ان
 متعلق کوئی مسلمان غور و فکر کرنے کا مجاز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ لفظ نظر مجمل ہے اور اس سے فہمگی

کے موجودہ مسائل کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ خود اجتہاد کے حدود و
استناد کا تعلق اجتہاد سے ہے جس میں بہر حال دورائیں ہو سکتی ہیں۔ اس بنا پر یہ کیونکر جائز ہوگا
کہ صرف ایک ہی پہلو کی صحت پر اصرار کیا جائے۔

فاضل مقالہ نگار پھر اپنے اس نظریہ کی تائید میں چند تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں
”مزید برآں تاریخی نقطہ نظر سے بھی یہ موقف صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ نے تطبیقات ثلاثہ کے
متعلق جو فیصلہ کیا یا اراخی سواد کی تقسیم کو جو عمومی مصالح کے پیش نظر روکا اس سے کسی طریق سے بھی
اس زاویہ نگاہ کی تائید کا سامان ہم نہیں پہنچ پاتا۔“

مندرجہ بالا اقتباسات کو ذرا غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ امت مسلمہ کو کس چیز کی تعلیم دی جا
رہی ہے۔ اسے یہاں سمجھایا یہ جارہا ہے کہ نصوص پر بھی وقتی مصلحتوں کے پیش نظر اجتہاد کی غنچی
چلائی جاسکتی ہے اور ان سے صرف نظر کرتے ہوئے بھی ایک مسلمان اپنے ضابطہ حیات کی تشکیل
کر سکتا ہے۔

اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اجتہاد کی بنیاد کیا ہے۔ اگر اس
کی بنیاد صرف عمومی مصالح ہیں تو پھر اسلامی اجتہاد اعماً زاد رائے میں کوئی فرق بجز اس کے باقی نہیں
رہتا کہ مسلمانوں نے اپنی قانون سازی کا نام اجتہاد رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے اسی مفہوم کو اپنی اپنی
ذبانوں اور اپنی بولیوں میں دوسرے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو پھر
امریکن پارلیمنٹ، برطانوی ایوان عام اور بھارت لوک سبھا کی قانون سازی سب گویا اسلامی اجتہاد
ہی ہیں کیونکہ ان کے اراکین کے پیش نظر بھی اپنی اپنی قوم کے عمومی مصالح ہی ہوتے ہیں۔ اسلام میں اجتہاد
نصوص کے تضمنات پر کیا جاتا ہے اور اگر اجتہاد اپنی بنیادوں کو خود اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنے کی
جوہر رکھتا ہے تو پھر کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جو ”فقیر مصلحت میں“ کے خیالات و تصورات پر
پابندی عائد کرے۔

فاضل مقالہ نگار نے اجتہاد کے نصوص کے بارے میں ”اجتہاد“ کا جو مسک پیش کیا ہے وہ بڑا

گمراہ کن ہے۔ اور میں انہیں اس لیے کہ اپنے دعوے کی تائید میں جو واقعات انہوں نے بیان کیے ہیں وہ ان کی تصدیق کرنے کی بجائے اُن کے بالکل مخالف پڑتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا یا اراضی سواد کی تقسیم کو جن مقاصد کے پیش نظر روکا وہ قرآن حکیم اور سنتِ رسول کی ضد نہ تھی بلکہ تعلیماتِ الہی کے عین منشا کے مطابق تھے۔ آپ نے ان دونوں فیصلوں کی بنیاد و نصوص پر رکھی۔

تطلیقاتِ ثلاثہ کے باب میں جو احادیث وارد ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ دعویٰ تو بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے عہد مبارک میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ حدیثیں دونوں طرح کی ملتی ہیں۔ زیادہ ایسی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد طلاقوں کو بائن قرار دیا گیا اور بعض ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا گیا۔ ہم یہاں صرف دو احادیث پیش کرتے ہیں:

سہیل بن سعد سے روایت ہے کہ جب بنی عبدمنان کے بھائی نے اپنی بیوی سے لُحان کیا تو اس نے کہا یا رسول اللہ، میں بڑا ہی ظالم ہوں گا اگر اس کے بعد بھی اس کو بیوی بنا لے رکھوں۔ سواب میری طرف سے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔ (رواہ احمد)

”عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو بیک وقت ہزار طلاقیں دے دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا۔ ان میں سے تین اُن کا حق تھا بقیہ ۹۹۷ سب ظلم و بیدتی ہیں۔ مگر اللہ چاہے گا تو معاف کر دے گا اور اگر چاہے گا تو سزا دے گا۔“

یہ دونوں حدیثیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسی نص کو منہدم کر کے کوئی اجتہاد نہیں کیا بلکہ اپنے فیصلے کی بنیاد سنتِ نبوی پر رکھی۔

صاحب موصوف نے اراضی سواد کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ کی جس پالیسی کا ذکر کیا ہے

ان کے دعوے کی کسی طرح بھی مؤید نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جن عمومی مصالح کے پیش نظر عراق شام کی زمینوں کی تقسیم کو دیکھا اس کی بنیاد بھی تعلیمات الہی ہی تھی۔ اس تصفیہ میں نہ تو سیدنا عمرؓ کے ذاتی رجحانات کا دخل تھا اور نہ عمومی مصالح ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے اس میں شامل تھے۔ ان زمینوں کی تقسیم پر جو اختلاف رائے ہوا اس کا آخری اور قطعی فیصلہ احکامات الہی سے ہی حاصل کیا گیا۔ اس پورے واقع کی تفصیلاً کتاب الخراج اور کتاب الاموال میں مل سکتی ہیں۔ یہاں ہم اس پوری بحث کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ کیا کوئی اجتہاد قرآن اور سنت رسول سے صرف نظر کر کے بھی کیا جاسکتا ہے۔

عراق و شام فتح ہو جانے کے بعد زمین اور جائداد کے انتظام کے بارے میں مشورہ ہوا۔ مجلس شوریٰ میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت بلالؓ امدان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ بی زمینوں فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں جس طرح رسول اللہؐ نے خیبر کا کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کیا تھا۔

امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی، وہ چاہتے تھے کہ خلافت کے زیر انتظام زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔ مجلس شوریٰ کے دیگر ممبر حضرت علیؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عثمان غنیؓ جیسے اکابر صحابہ کی رائے حضرت عمرؓ کی موافقت میں تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اس فیصلے کی تائید میں فرمایا:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ ہی لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد میں والوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو۔ کیا آپ لوگوں کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور اس طبقہ میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی؟ بیواؤں اور حاجتمندوں کی نجات کہاں سے ہوگی؟ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں آپس میں منساہ کریں گے۔“

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنے زور دار الفاظ میں حضرت عمرؓ کے اس موقف کی تائید کی۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے ان سارے دلائل کو جن کی تائید کسی نص سے نہ ہوتی

نہی بعض صحابہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عبدالرحمنؓ اور حضرت بلالؓ کا مطالبہ یہ تھا:

رد جو مال اللہ نے ہیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے۔ وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے جس طرح رسول اللہ نے خیر تقسیم کر دیا تھا۔ یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی ذریت کے لیے ہیں اور بعد والے اپنی ذریت کے لیے جملے گئے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عبدالرحمنؓ اور حضرت بلالؓ کی اس دلیل کو عمومی مصالح کے پیش نظر دیا نہیں کیا، حالانکہ جلیل القدر صحابہ کی اکثریت خلیفہ دوم کی بہنوئی تھی، انھوں نے بجائے اپنا فیصلہ قوت کے زور سے نافذ کرنے کے احکامِ الہی سے تائید حاصل کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلہ میں سیدنا عمرؓ نے جو تقریر فرمائی وہ ان کے فہم و ادراک، ان کی کتاب و سنت سے والہانہ محبت اور ان کی وقتِ نظر اور وسعتِ قلب کی ایک بہت بڑی شہادت ہے، انھوں نے ارشاد فرمایا:

”میں نے آپ حضرات کو محض اس لیے فوری تکلیف دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ ہی

لوگوں نے میرے سر پر رکھا ہے اس کے اٹھانے میں میرے شریک ہیں۔ اس وقت مجلس میں میری پند لیشن خلیفہ کی نہیں ہے بلکہ آپ میں کے ہر فرد جیسی ہے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا بالکل اختیار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کہ اس معاملہ میں مشورہ ہو چکا ہے۔ مجلس کے

کچھ لوگوں نے میری رائے کی مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا

کہ آپ میری مرضی کا اتباع کریں اور حق بات کو چھوڑ دیں میں تو صرف ایک حق بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جس طرح میرے پاس اللہ کی کتاب ہے۔ ویسے ہی آپ لوگوں

کے پاس بھی اللہ کی کتاب موجود ہے جو ناطق بالحق ہے اس کو سامنے رکھ کر مجھے مشورہ دیجیے

جو کچھ اس میں موجود ہے اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے۔“

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دعوے کی تائید میں سورۃ الحشر کی مندرجہ ذیل آیات پیش کیں

یہ نئے کہان ان معنی میں ہجرتوں کے لیے ہے جو اپنے
گروں سے نکلے گئے، جن کے مال چھین لیے گئے،
جو اللہ کے فضل اور اس کے عفو بخشنے کے طالب
ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی
لوگ پچھے ہیں۔ اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے
جو پہلے سے اس گھر (مدینہ) میں ایمان کے ساتھ
جا کر ہیں تھے، جو محبت کرتے ہیں ان لوگوں سے جو
ان کی طرف ہجرت کر کے آئیں، جن کا حال یہ ہے
کہ وہاں جہن کو عوام کچھ بھی دیا جائے وہ اس گھر نہیں
مانتے، بلکہ اپنی جانوں پر ان کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ
ان پر ناتوامی کی نوبت آجائے۔ اور جو لوگ اپنے
نفس کے لالچی پن سے پڑ گئے وہی نفاق پانے والے
ہیں۔ اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے
بعد آئیں۔

حضرت محمد صادق رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو تقسیم کرنے کا جو فیصلہ صادر فرمایا، اس کے لیے
انہوں نے قرآن حکیم کی اس آخری آیت وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْكُمْ مِنْكُمْ لِيَاكُونَ كَمَا
عمر کے اس استدلال سے سب نے مکمل طور پر اتفاق کیا اور کہا کہ میں آپ ہی کی رائے اس معاملہ
میں درست ہے۔

اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا:

”اب یحییٰ اطمینان ہڑا کہ میں حق پر تھا اور اس معاملہ میں میری رائے درست تھی۔“

قاضی ابویوسف اس فیصلہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی تصنیف کتاب الخراج
راوی ص: ۱۰۸

(بقیہ اشارات)

میں لکھتے ہیں:

والسدى رأى عمر رضى الله عنه من
الامتناع من قسمة الارضين بين من
انقته عند ما عرفه الله ما كان في
لتأيد من بيان ذلك توفيقا من الله كان
له فيما صنع وفيه كانت الخيرة لجميع
المسلمين -

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ آپ نے مجاہدین اور فاتحین
کے درمیان زمین تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور
اس کی تائید میں قرآن حکیم سے دلائل پیش کیے۔ یہ
سب کچھ محض اللہ کی توفیق کا نتیجہ تھا اور اللہ کی کتاب
میں بصیرت حاصل ہونے کی بنا پر تھا۔ یہ واقعہ ہے
کہ جس حقیقت کو حضرت عمرؓ کی نگاہ نے پایا تھا اصل
اس میں جماعتی لحاظ سے تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی۔

بات ذرا طویل ہو گئی ہے لیکن اس کے عرض کرنے سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جو لوگ یہ
سمجھتے ہیں کہ عمومی مصالح کے پیش نظر نصوص کو بھی نظر انداز کیا جاسکتا ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا
ہیں۔ ایک ایسی غلط فہمی جو ایسا اوقات ایک انسان کو کھلی گمراہی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ حضرت
عمرؓ نے بلاشبہ اجتہاد کیا لیکن ان کے کسی اجتہاد سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے کسی وقت بھی
کسی نص سے حرفِ نظر کیا تھا۔ انہوں نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ کیا وہ تعلیماتِ الہی کی بنیاد پر ہی تھا۔